© rasailojaraid.com

محمود مرزا

''نالج اکانومی'' (علمی معیشت) اور ہمارا اندازِ فکر

آیئے غور کریں کہ پاکستان میں موجودہ تہذیب اور ہمارا اندازِ فکر اکیسویں صدی کی اُبھرتی علمی معیشت (نالج اکانومی) کے تقاضوں سے کہاں تک ہم آہنگ ہیں۔ ہم اس امر پر بھی غور کریں گے کہ ہمارے افکار اپنے فطری بہاؤ میں نالج اکانومی کی جانب پیشرفت کے لیے کتنے موزوں ہیں۔ یہاں بحث یہ نہیں کہ نالج اکانومی یا انفرمیشن ایج اچھی چیزیں ہیں یا نہیں۔ یہ معاملات ہمارے طے کرنے کے نہیں، انہیں سائنسی ترقی نے طے کر رکھا ہے۔ صنعتی دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے یہ چیزیں اس کا فطری نتیجہ ہیں۔

علمی معیشت کا مختصر تعارف ضروری ہے۔ اس معیشت میں جدید ترین علم کو معاشی مفاد کے لیے بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا امریکہ میں 1955ء میں ہوئی جب کمپیوٹر کا معاشی عمل میں استعمال شروع ہوا۔ کمپیوٹر معلومات کے ذخیرے تک رسائی مہیا کرتا ہے اور معلومات ایک جگہ سے دوسری جگہ فی الفور منتقل کرتا ہے۔ جب کمپیوٹر کو پیداواری عمل میں شریک کیا جائے تو عمل میں تیزی اور معیار میں عمدگی پیدا ہوتی ہے۔ علمی معیشت میں میٹریل میں بھی تبدیلی آئی۔ بہت سا میٹریل انسان سائنسی معلومات کی بنیاد پر خود تیار کرنے لگا ہے۔ کارکنوں کے اعتبار سے اس معیشت کی خصوصیت یہ ہے کہ عام طور پر ان کی دماغی صلاحیتوں کا کردار بڑھ گیا ہے۔ جدید مشینوں میں کام کی نوعیت کو پرکھنے اور سوچنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ آسان الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ علمی معیشت میں مشین میں انسانوں کی طرح سوچنے کی صلاحیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُجاگر کر دی گئی ہے۔ جبکہ صنعتی دور میں عام محنت کش غبی مشین کی طرح کام کرتا تھا۔ علمی معیشت کا کارکن اپنی صلاحیت بروئے کار لانے کے لیے جسمانی ہی نہیں بلکہ نفسیاتی اور وجدانی طور پر معاشی عمل میں ڈوبنے پر مجبور ہوتا ہے، وگرنہ اس کی کارکردگی ناقص ہوگی۔ مشینوں کی کارکردگی جتنی بڑھتی جا رہی ہے، صنعتی کارکنوں کی مطلوبہ تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ علمی معیشت کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ عالمی معیشت کی کل پیداوار میں جو اضافہ واقع ہو رہا ہے، وہ جدید ہائی ٹیک ایجادات اور ریسرچ کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ 1997ء کے اعداد و شمار کے مطابق دُنیا کی ترقی یافتہ بیس فیصد آبادی کے پاس عالمی دولت کا 86 فیصد حصہ تھا، جبکہ بیس فیصد پسماندہ آبادی کا حصہ صرف 1.3 فیصد تھا۔ گویا دولت پسماندہ ممالک کی جانب سے ترقی یافتہ ممالک کی طرف منتقل ہوتی جا رہی ہے۔

ہائی ٹیک ایج میں وہ ممالک معاشی سبقت حاصل کر رہے ہیں جو برقی شعاعوں، بیالوجی، جینومکس اور میٹابولک انجینئرنگ میں نسبتاً ترقی یافتہ ہیں۔ یہ علوم پیداواری عمل اور انسانی زندگی کے بے شمار شعبوں میں انقلابی تبدیلی پیدا کر رہے ہیں۔ اکیسویں صدی بیالوجی کی ہوگی۔ اس سائنس میں زبردست ترقی جاری ہے۔ جینومکس (جینیاتی علوم) نے اسے بڑی وسعت اور گہرائی دی۔ ماہرین کے بقول جینیاتی انقلابات ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ یعنی بات Synthetic Biology (سینتھٹک بیالوجی) اور Bio-informatics تک پھیل چکی ہے۔ ان علوم نے زرعی پیداوار کو Ethanol کی تیاری کی طرف موڑ کر خوراک کی عالمی قلت اور مہنگائی پیدا کر دی ہے۔ (ایتھونل مہنگے پٹرول کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔) یہی مثال ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ سائنسی ترقی کو انسانی فلاح کے مقصد سے متصادم نہیں ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے عالمی سطح پر ایسے اصول و قواعد بنانے پڑیں گے کہ انسانوں اور ماحولیات کے بہبود کے مقاصد سے نہ صرف انحراف نہ ہو بلکہ یہ مقاصد آگے بڑھتے رہیں۔ یہ کام آسان نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو سائنسی اعتبار سے ترقی یافتہ قومیں اس پوزیشن میں ہوں گی کہ پسماندہ قوموں کو کسی نہ کسی بحران میں مبتلا رکھیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علمی معیشت ان معاشروں میں پروان چڑھی ہے جہاں سوچنے کی آزادی تھی اور تحقیق اور ایجادات کے لیے معاوضہ بہت زیادہ تھا۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ معاشی پیداوار میں جو اضافہ واقع ہو رہا ہے، اس کی 70 سے 80 فیصد وجہ سائنسی ریسرچ اور اعلیٰ ٹیکنالوجی ہے۔ 2005ء کے اعداد و شمار کے مطابق دُنیا کی کل پیداوار 44.4 ٹریلین ڈالر تھی جس کا 29.28 فیصد حصہ امریکا کی علمی معیشت کا ہے۔ دوسرے نمبر کی علمی معیشت جاپان کی ہے جس کا عالمی پیداوار میں حصہ 10.81 فیصد ہے، تیسرے درجے پر جرمنی ہے جس کا حصہ 6.76 فیصد ہے۔ چوتھے درجے پر برطانیہ ہے، جس کا حصہ 5.63 فیصد ہے۔ گویا دُنیا کی پیداوار کا نصف سے زیادہ حصہ ان چار ممالک سے آتا ہے جو ٹیکنالوجی کے اعتبار سے بڑے ترقی یافتہ ہیں۔ کچھ دوسری مغربی معیشتیں بھی علمی ہیں۔ ''نالج اکانومی'' کے حامل مغربی ممالک اور جاپان ''نالج سوسائٹی'' شمار ہوتے ہیں جہاں فکری آزادی ہے اور وہ متوقع تبدیلیوں کا پیشگی اندازہ کر کے ضروری اصلاحات کر لیتے ہیں۔ جنوبی کوریا علمی معیشت میں داخل ہو رہا ہے اور چین اور بھارت بھی اسی جانب رواں ہیں۔ تاہم یہ معاشرے علمی نہیں، ان کی قیادت مستقبل شناس ضرور ہے۔ بھارت کی کمپیوٹر سروسز کے ذریعے زرِمبادلہ کی آمدن تیس ارب ڈالر سے زیادہ ہے۔ بھارت میڈیکل سروسز کے ذریعے بھی اربوں ڈالر کا زرِمبادلہ کمانے لگا ہے۔ خیال رہے کہ پاکستان کی کمپیوٹر سروسز سے آمدن ایک ارب ڈالر کے لگ بھگ ہے۔ نالج اکانومی کو پروان چڑھانے میں ملٹی نیشنل کارپوریشنوں نے اہم کردار ادا کیا۔ عالمی معیشت کے پیداواری اثاثوں کے 25 فیصد کی مالک 300 بڑی کارپوریشنیں ہیں۔ آزاد عالمی معیشت کا انتہائی افسوسناک پہلو یہ ہے کہ یہ ایک جانب ترقی یافتہ اور پسماندہ ملکوں کے مابین اور دوسری جانب ہر ملک کے امیر اور غریب طبقات میں دولت کی تقسیم کا فرق بڑھا رہی ہے۔ یہ معاملہ الگ مفصل بحث کا طالب ہے۔ اشارۃً عرض ہے کہ منصفانہ نظام کے قیام کے لیے ایک جانب عالمی سطح پر اور دوسری جانب ہر ملک میں قومی سطح پر ذمہ دار سیاسی تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ تاہم یہ معاملہ پاکستان کو اپنی معیشت کو جدید ترین علوم پر استوار کرنے سے تاخیر کا جواز فراہم نہیں کرتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ ہم جدید علوم اور ٹیکنالوجی پر قائم معیشت کی طرف پیش رفت کے لیے کیا منصوبہ بندی کریں؟ یہ منصوبہ بندی پاکستان کے سب علاقوں کے لیے یکساں نہیں ہوگی۔ سماجی ارتقا کے اعتبار سے ہمارے یہاں تین طرز کی تہذیبیں ہیں۔ کچھ علاقوں میں قبائلی نظام رائج ہے، کئی زرعی علاقوں میں فیوڈل نظام پایا جاتا ہے اور نسبتاً ترقی یافتہ علاقوں میں آسان ٹیکنالوجی کی صنعتیں پائی جاتی ہیں۔ گنجان شہروں میں صنعتوں کے علاوہ تجارت اور معاشی سروسز فروغ پا رہی ہیں۔ کوئی علاقہ بھی اعلیٰ سائنس اور جدید ٹیکنالوجی پر منحصر معیشت کی ذمہ داری اُٹھانے کا اہل نہیں۔ ہر علاقے کے لیے ترقیاتی منصوبہ بندی الگ الگ ہوگی۔ یقیناً 25، 30 سال کی منصوبہ بندی سے ہم جدید سائنس پر قائم معیشت استوار کرسکیں گے۔ تاہم دُنیا میں امن اور انصاف کی ضرورت ہے۔ اس کا امکان اسی صورت میں ہے کہ ادب، فلسفہ اور سماجی علوم سے بھی اغماض نہ برتا جائے۔

معاشی ترقی کے منصوبوں، سماجی ارتقاء کے تقاضوں اور نظامِ تعلیم میں ایک ربط ہونا چاہیے۔ منصوبے سلسلہ وار ہوں۔ پہلا منصوبہ فوری عملدرآمد کے لیے ہو، دوسرا دس سالہ ہو اور تیسرا پچیس سالہ۔ اگر جمہوری استحکام ہو، قانون کی عملداری ہو، منصوبہ بندی ہو، نظامِ تعلیم جدید ہو اور سب سے بڑھ کر ترقی کی لگن ہو تو پھر سرمایہ کاری اور ہنرکاری کے دروازے کھل جاتے ہیں اور ترقی کا سفر جو یورپ نے ایک صدی میں طے کیا، ہم ایک دہائی میں مکمل کرلیں گے۔ تین دہائیوں میں ہم یورپ کے تین سو سال کا سفر طے کرسکتے ہیں۔

علمی معیشت قائم کرنے کے لیے اصلاحات کے کئی کام حکومت کے کرنے کے ہیں اور کئی کام سیاسی پارٹیوں کے۔ مگر کئی کام ایسے ہیں جو غیر سیاسی تنظیمیں کیا کرتی ہیں۔ اس معاملے میں باشعور حلقوں کو رائے عامہ تیار کرنے کی ذمہ داری اُٹھانی ہوگی۔ انہیں تعلیم کا نصاب اور سوچ کا انداز نالج اکانومی کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔ اگر ہم نے یہ کام نہ کیا تو ظاہر ہے، ہمارے یہاں پسماندگی کو نہ صرف دوام ملے گا بلکہ اس میں اضافہ ہوگا۔

ہمیں غور کرنا ہوگا کہ پاکستان سائنسی ترقی اور علمی معیشت کے تقاضے پورے کرنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے قابل کیوں نہ بنا۔ اس سوال کو ہم یوں بھی اُٹھا سکتے ہیں کہ پاکستان میں جدید علوم کو فروغ کیوں حاصل نہ ہوا۔ ہمارا سماج فیوڈل اور قبائلی تھا اور سماجی قوتیں جن کے پاس رہبری کا فریضہ تھا، اُن کا رویہ غیر سائنسی اور روایتی مذہبی تھا۔ سیاسی عمل کے دوران میں مؤثر حلقوں کی توجہ اسلامی نظریے سے جذباتی اظہار پر مرکوز ہوگئی۔ 1949ء میں قرار داد مقاصد کے ذریعے پاکستان کی پارلیمان کے اکثریتی (مسلمان) ارکان نے اسلامی تعلیمات کو مسلمانوں کی نجی زندگی اور ملک کی قومی زندگی کے لیے مشعل راہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ جہاں تک قومی زندگی کا تعلق ہے، ہمارے پاس بیسویں صدی (جو تب تھی) کے اہل کوئی ماڈل نہیں تھا۔ ہمارے پاس عقیدہ تھا، جوش تھا، علم اور صلاحیت نہیں۔ عالم اسلام میں کہیں بھی صنعتی دور (جو تب تھا) کے تقاضوں کے مطابق اسلامی افکار میں قابلِ ذکر اجتہاد نہیں ہوا۔ کچھ معاملات، جن میں پیشرفت ہوئی، قومی زندگی میں اہم کردار کے حامل نہ تھے۔ پاکستان کے رہنماؤں نے شروع شروع میں ''اسلام کی راہ'' اختیار کرنے کی بات کی۔ اُنہوں نے طے کیا کہ قانون سازی اور دوسرے امور میں کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہو۔ 1977ء کے بعد ایک فوجی حکمران نے قانون بنایا۔ جس کی رو سے تصادم سے بچنے کی پالیسی کے ساتھ ساتھ، شریعت کے نفاذ کی آئینی ذمہ داری بھی قبول کر لی گئی۔

یہاں مسلمانوں کے مذہبی افکار میں جمود کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ بے شبہ جمود ہماری سماجی زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہوا۔ ہمارے مذہبی افکار میں جمود فطری تھا، اس لیے کہ سماجی علوم اور سماجی فکر میں جمود موجود تھا۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آٹھ سو سال پہلے مسلمانوں کی تہذیبی ترقی رک گئی اور زوال کی ابتداء ہوئی۔ ہمارے ہاں عام خیال کے مطابق مسلمانوں کے زوال کا سبب جدید علوم وفنون سے اغماض اور فکری قیادت کی نااہلی نہیں بلکہ روایتی مذہب کی تقلید میں کوتاہی ہے۔ ہم نے ماضی کو سراہا ہے۔ ہم نے مستقبل کے لیے تیاری نہیں کی۔ ہمارے لیے توجہ کے قابل مستقبل مرنے کے بعد آئے گا۔ اس لیے ہماری دُنیاوی زندگی پسماندہ رہی، سوائے بالادست طبقات کے جنہوں نے اخلاقی اقدار ترک کر کے دولت حاصل کی مگر عوام کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عبادات پر قانع رکھنے کا وعظ سنایا۔

جب یورپ میں علوم وفنون کی ترقی شروع ہوئی اور وہ صنعتی دور میں داخل ہوا اس نے حکومتی معاملات میں مذہب کی مداخلت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ طویل کشمکش کے بعد وہاں سیاست اور مذہب کے شعبے الگ الگ ہو گئے۔ سیاسی حکمران اور چرچ اپنے اپنے شعبوں میں بااختیار ہو گئے۔ جبکہ مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے کسی فیصلے کی ضرورت نہ محسوس ہوئی، اس لیے کہ مسلمان حکمرانوں نے دینی علما کو سیاست سے دور رکھا۔ صرف خلافتِ راشدہ کے عہد میں دینی اور سیاسی قیادت یکجا رہی۔ اہم بات یہ ہے کہ مسلم ممالک میں بڑے ذریعۂ روزگار (زراعت) پر کنٹرول حکمران کا ہوتا تھا۔ زرعی اراضی کی تقسیم کا اختیار سلطان یا بادشاہ کو حاصل رہا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم دنیا میں دینی رہنما اور دینی افکار الا ماشاءاللہ بالا دست طبقہ کے مفاد کے تابع رہے۔ مسلم سلاطین کے ادوار میں عام طور پر سیاست اور مذہب نے ایک دوسرے کے لیے کوئی بڑی مشکل پیدا نہیں کی۔ سیاسی حکمران اپنے سیاسی اور طبقاتی مفاد کے لیے جائز اور ناجائز، اسلامی اور غیر اسلامی ہتھکنڈے استعمال کرتے رہے۔ عام مسلمانوں نے یہ سب کچھ قبول کیا۔ شاید نظریۂ ضرورت کا تقاضا یہی تھا۔ انہیں خطرہ تھا کہ اگر مسلمانوں میں نفاق اُبھرا، غیر مسلم رعایا یا پڑوسی حکمران (دشمن) فائدہ اُٹھائے گا۔ بالادست طبقے اسلام کی روح یعنی انصاف پر کاربند نہ تھے، عام مسلمان اسلام کی رسوم و رواج کے پابند رہے۔ یہی بات حکمرانوں کے حق میں بہتر تھی۔ گذشتہ آٹھ سو سالوں میں مسلمانوں نے سماجی علوم، فزیکل سائنسز اور ٹیکنالوجی میں ترقی نہیں کی۔ مسلمانوں کی تہذیب میں جمود آ چکا تھا۔ مسلم دنیا میں صنعتی انقلاب نہیں آیا۔ مسلم معاشرے بدستور قبائلی، فیوڈل اور زرعی رہے۔ روایتی مذہبی تعبیریں ان ادوار کے تقاضوں کو پورا کرتی رہیں۔ اس دوران یورپی ممالک میں علمی فروغ ہوا، صنعتی انقلاب آیا۔ نتیجتاً ان کی فوجی طاقت بڑھی۔ یورپی ممالک مسلم حکمرانوں کو فوجی شکست دے کر ان کی سلطنتوں پر قابض ہو گئے۔ یورپی حکمرانوں نے مفتوحہ علاقوں میں معاشی اور انتظامی نوعیت کی تبدیلیاں کیں۔ نظم ونسق کے نئے ادارے اور نئے قوانین رائج کیے جو صنعتی دور یا ان کی حکمرانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے تقاضوں کے مطابق تھے۔

یوں مفتوحہ مسلم علاقے ایک نئی صورت سے دو چار ہو گئے۔ مسلم رعایا تہذیبی اور فکری اعتبار سے قبائلی اور زرعی دور میں رہنے کی عادی تھی۔ جب کہ یورپی حکمران صنعتی دور اور عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ استحصالی بھی تھے۔ اس صورت حال میں مسلم دانشوروں اور رہنماؤں کا ردِّعمل یہ تھا: ایک یہ کہ صنعتی دور کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کے مذہبی افکار میں اجتہاد ہونا چاہیے، تاکہ نئے دور کے ساتھ تضاد دور ہو اور مسلمانوں کو ترقی کی دوڑ میں شامل ہونے میں سہولت ہو۔ برصغیر میں سرسید اور علامہ اقبال صنعتی دور کے مطالبے کے مطابق اجتہاد کے حامی تھے۔ دوسرا مکتب فکر یہ تھا کہ ہم مذہبی افکار کی روایتی تعبیر پر قائم رہتے ہوئے بزعم خود غیر مسلم آقاؤں کے اثر سے محفوظ رہیں۔ مذہبی افکار کی روایتی تعبیر قبائلی، زرعی اور عرب امپریلزم کے ادوار میں پروان چڑھی تھی۔ اس اندازِ فکر کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ مختلف الخیال مذہبی مسلکوں اور مذہبی فرقوں میں منقسم تھی۔ پاکستان میں یہ تقسیم ''نفاذِ اسلام'' کے بعد بڑھی ہے، اِس تقسیم کو آمریت کے خلاف مشترک سیاسی جدوجہد نے کنٹرول کیا۔ البتہ جنونی فرقہ پرست گروہ کسی کے کنٹرول میں نہیں رہے۔

پاکستان نے نفاذِ اسلام کے لیے جو اقدام اُٹھائے وہ پہلے سے رائج روایتی افکار کے مطابق تھے۔ نفاذِ اسلام کے حامی یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ پاکستان کا معاشرہ خالص روایتی، قبائلی اور زرعی نہیں رہا، اس میں کئی اِعتبار سے تبدیلی آ چکی ہے۔ قبائلی اور دیہی علاقوں سے آبادی شہروں کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ معاشرے کے خوشحال اور امیر طبقے نیا طرزِ زندگی اختیار کر رہے ہیں۔ ان کا رہن سہن، ان کے تجارتی اور رہائشی مراکز روایت شکن بن چکے ہیں۔ کاشتکاری میں مشینوں کا استعمال دیہی زندگی بدل رہا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں تاجر، طالبعلم اور عام شہری دوسرے ملکوں کا سفر کرتے ہیں اور نئی تہذیب سے روشناس ہوتے ہیں۔ آسان ٹیکنالوجی کی صنعتیں فروغ پا رہی ہیں۔ عالمی میڈیا ہمارے روایتی کلچر پر چوٹیں مار رہا ہے۔ بچے جو وسائل کا بندوبست کر سکتے ہیں، انگلش میڈیم سکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ تاہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاشرہ مجموعی طور پر فکری اور علمی اعتبار سے پسماندہ ہی ہے۔ ہمارا واسطہ جس دُنیا سے ہے وہ انفرمیشن عہد میں داخل ہو رہی ہے۔ اس دور کا طاقتور میڈیا جن قوموں کے ہاتھ میں ہے، ان ہی کا تہذیب و تمدن اس دور کا مؤثر تہذیب و تمدن بن گیا ہے۔ یہ عالمی تہذیب و تمدن دوسرے سب معاشروں کی طرح ہمارے معاشرے پر بھی اپنی چھاپ بڑھا رہا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ آج کا ملک، چاہے پسماندہ ہو، عالمی گاؤں ہی کا حصہ ہے۔ اس کے لیے گاؤں کے اثر، ڈسپلن اور قوانین سے بچنا ممکن نہیں۔ ان سب باتوں کا شعور ان افراد کو نہیں جو ذہنی اور فکری اعتبار سے اُس دور میں نہیں رہتے جس میں وہ سانس لیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ شعور پر حاوی ہے، وہ حالات کو اپنی پسند کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔ جو ناممکن ہے۔

ہمارے ملک میں ہر علاقے کا اپنا اپنا تہذیب و تمدن ہے۔ مثلاً پختون قبائلی علاقے کا تمدن اپنا ہے اور کراچی کا اپنا۔ قبائلی لوگوں نے (جو وزیرستان میں رہیں یا کراچی میں) نفاذِ اسلام کی اس تعبیر کو قبول کیا ہے جو جنرل ضیاء الحق نے کی، مگر وہ طبقے جو تہذیب و تمدن کے اعتبار سے قبائلی نہیں اس تعبیر کو قبول نہ کر سکے۔ لیکن نفاذِ اسلام کا معاملہ قانون کا ہے جو سب کے لیے یکساں ہے۔ یوں اسلامی قوانین کے نفاذ نے ان مسائل میں اضافہ کر دیا ہے جو ملک میں تہذیب و تمدن کے فرق کی وجہ سے پہلے سے موجود تھے۔ اس طرح ملک میں عدم استحکام بڑھا ہے۔

اب بہت سی چیزیں اکٹھی ہوگئیں۔ اوّل ہمارا معاشرہ نیم قبائلی، نیم فیوڈل اور نیم صنعتی ہے۔ دوم، اس کا بیشتر قانونی ڈھانچہ سوائے قبائلی علاقوں کے صنعتی اور غلامی کے دور کے مطابق قائم ہوا تھا، اسی میں اسلام کے صحیح احکام کی بجائے روایتی مذہبی قوانین بھی ہیں۔ سوم، ہمارا ملک عالمی گاؤں کا حصہ ہے۔ یہ گاؤں جو صنعتی دور سے آگے انفرمیشن دور میں داخل ہو چکا ہے۔ اور چہارم یہ کہ اسلام کی جس تعبیر کو ہم اپنے معاشرے میں رائج کرنا چاہتے ہیں اس کا بہت سا حصہ فکری اعتبار سے قبائلی اور زرعی دور کے مطابق ہے۔ یہ چاروں خصوصیات باہم ہم آہنگ نہیں۔ اور پانچویں بات یہ کہ ہمارے تعلیمی نصاب میں جدید سماجی اور فطری سائنسز کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معیار بوسیدہ اور از کارِ رفتہ ہے۔ مزید برآں پاکستان میں نفاذِ اسلام کے تجربے نے ثابت کیا کہ اسلام کے بلند اخلاق کے فروغ کی بجائے فرقہ پرستی کو ہوا ملی اور بعض روایتی مذہبی حلقوں میں تشدد کا رجحان بڑھا۔

ہمارا دعویٰ ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل ہے۔ (معاشرہ سے مراد انسانوں کا ایک گروہ ہے جس میں مفادات اور ضروریات کی سانجھ ہو جن کی تکمیل کے لیے سوشل سسٹم موجود ہو) سچ یہ ہے کہ سوشل سسٹم کی تشکیل کے لیے قابلِ عمل فکر کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ اسلامی فکر کا اجتہاد صنعتی دور سے بہت پہلے ہی رُک گیا تھا۔ (یہ رُکنا فطری تھا کیونکہ معاشرے میں علمی فروغ اور معاشی ترقی نہ ہوئی۔) فرض کریں کہ ترقی بتدریج جاری رہتی تو صورت حال بالکل دوسری ہوتی۔ ہمارے سماجی اور مذہبی افکار وہ نہ ہوتے جو آج ہیں، مسلم معاشرے کی شکل اور مسلمانوں کی سماجی زندگی اُس سے کہیں مختلف ہوتی، جو آج ہے۔ اور شاید دنیا کی تہذیب و ہیت بھی ایسی نہ ہوتی جو آج ہے۔ خلاصۂ بحث یہ ہے کہ ہم مسلمان چاہتے کچھ ہیں، کرتے یا کرنے پر مجبور کچھ اور ہیں؟ ہم شدید دُوئی میں مبتلا ہیں۔ یہ دُوئی ہماری ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ معاملہ سوچ اور عمل میں تضاد کا ہی نہیں، ایک اور اعتبار سے تشویشناک بھی ہے، مسلم معاشرے کی روایتی اور لبرل دھڑوں میں تقسیم وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری سوسائٹی سوچ کے اعتبار سے دو طاقتور گروہوں میں تقسیم ہونے کی طرف مائل ہے۔ ایک گروہ کے پاس جدید علوم کی کچھ نہ کچھ شد بد ہے۔ دوسرے کے پاس عقیدہ ہے، اسلحہ ہے اور مرنے مارنے کا جذبہ۔ یہ بات معاشرے کے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ روایت پرست سوچ علمی معیشت کے تقاضوں سے متصادم ہے۔ اسلحہ کا غلبہ مسلمانوں کو غربت، مذہبی جنونیت اور آمریت کی طرف لے جائے گا۔ کیا اس مسئلے کا کوئی حل ہے؟ جواب مشروط اثبات میں ہے۔ ہمیں اخلاقی زندگی کو صحت مند بنانے کے ساتھ ساتھ جدید علوم کو فروغ دینا ہوگا اور سماجی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا ہوگا۔

ترقی کے خواہش مند ملکوں کے لیے سماجی علوم کی نوعیت بدل چکی ہے اور بدلتی رہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گی۔ سائنسی تحقیقات اور نئی ٹیکنالوجی نئے مسائل کھڑے کریں گے۔ نئے تصورات اور نئی تھیوریاں بنیں گی۔ نئی نصابی کتب بنیں گی۔ بدلتے تقاضوں کے مطابق اساتذہ کو بار بار ریفریشر کورس کرنے ہوں گے۔ ہر ترقی پسند قوم کو اپنے سماج اور سیاسی و انتظامی ڈھانچوں میں بار بار تبدیلی کی ضرورت ہوگی۔ قوم کے لیے حکمت عملی بنانے والوں اور قانون سازوں کو اپنے افکار پر نظرِ ثانی کرتے رہنا ہوگی۔ انفرمیشن سوسائٹی اسی کا نام ہے۔ ایسی بدلتی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت صرف ایک کشادہ فکر والی سوسائٹی ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے سوچنے کا مسئلہ یہ ہے کہ کیا پاکستان کا روایت پرست معاشرہ اتنی صلاحیت پیدا کر سکے گا کہ وہ انفرمیشن سوسائٹی کے تقاضوں کا پیشگی اندازہ لگا کر بروقت ضروری اصلاحات کر سکے، ہرگز نہیں۔ یہ صلاحیت پیدا کرنے کے لیے تعلیم و تدریس کے نصاب اور طور طریقوں کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں تدریس کا ایسا اسلوب اختیار کرنا ہوگا اور اتنی آزادی دینا ہوگی کہ طالب علموں میں سوچنے کی صلاحیت پیدا ہو، سوال اُٹھانے کی ہمت پیدا ہو، طالب علم حصول تعلیم میں شرکت اختیار کرے، تجزیہ کرے، بحث میں حصہ لے۔ گویا علم کی ترقی میں حصہ دار بنے۔ ضروری ہے کہ ہم قوم کو فکری اعتبار سے اکیسویں صدی میں لائیں۔ اُن میں سائنسی اندازِ فکر کی صلاحیت پیدا کریں۔ اس اندازِ فکر سے ہم آج کی دُنیا کے معاملات سمجھ سکتے ہیں۔ اس کا ایک زود اثر اور آسان طریقہ یہ ہے کہ سائنسی ترقی کی ڈاکومنٹری فلمیں دکھانے کا بندوبست کیا جائے۔ بالخصوص دورانِ تعلیم ایک گھنٹہ ایسی ڈاکومنٹری فلموں کے لیے مختص کر دیا جائے۔ دینی مدارس میں بھی ایسی ڈاکومنٹری دکھانے کی سہولیات فراہم کی جائیں۔ یہ طرزِ فکر قوم کے ذہن میں وسعت اور سائنسی رویہ پیدا کرنے کا باعث ہوگا جو قوم میں آگے بڑھنے اور عالمی گاؤں کی صفِ اوّل میں جگہ پانے کا جذبہ اُبھارے گا۔

© rasailojaraid.com